بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جن حضرات نے گذشتہ تین چار ماہ میں جماعت اسلامی اور اُس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر مختلف الزام فرماؤں کی طرف سے بھرپور نوازشات کی داستانیں سُنی ہیں وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ ارتداد دین جیسے سنگین الزام کے ثبوت میں جہاں عورت کی صدارت کا مسئلہ پیش کیا گیا وہاں دوسری دلیل یہ بھی پیش کی گئی کہ جماعت اسلامی جو اسلامی نظام کے قیام کا داعیہ لیکر اٹھی تھی اُس نے اپنا کعبۂ مقصود بدل کر اب جمہوریت کی سربلندی کے لیے اپنی جان کھپانی شروع کر دی ہے یقیب العین سے یہ انحراف بلکہ ارتداد اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ جماعت دنیا پرست طالع آزماؤں کا ایک ٹولہ ہے جو دین کے نام پر اپنی سیادت قائم کرنا چاہتا ہے۔

جہاں تک عورت کی صدارت کے معاملہ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ہم ماہ جنوری کے اشارات میں جماعت کے موقف کی وضاحت کر چکے ہیں آج ہمیں اس دوسرے معاملہ کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

یہ حضرات جماعت کے ارتداد کو ثابت کرنے کے لیے اُس کے وسیع لٹریچر میں سے چُن چُن کر وہ باتیں سامنے لاتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ آغاز میں جماعت مغربی طرز کی جمہوریت کی شدید دشمن تھی اور اسے اسلام اور مسلمانوں کے لیے فتنۂ عظیم سمجھتی تھی۔ اس کے بعد وہ اسلامی جمہوریت کی علمبردار بن کر سامنے آئی اور اب لفظ "اسلامی" کو بھی چھوڑ کر خالص مغربی جمہوریت کے شیدائی کی حیثیت سے جدوجہد کر رہی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک اسلام

اور مسلمانوں کے لیے یہ ایک زبردست المیہ ہے کہ یہ جماعت جس باطل نظامِ سیاست کو ختم کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی، اب اسی کی سربلندی کے لیے نہ صرف کوشاں ہے بلکہ اسی کو اپنی جدوجہد کا مطلوب و مقصود قرار دیتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ایک بزرگ نے جماعت اسلامی کے اس انحراف پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے:

"اتنے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اس ذلت کے ساتھ پسپائی، بلکہ ہتھیار رکھ دینے کا اعلان، محاذِ اسلامی پر کبھی کسی امیرِ لشکر نے کیوں کیا ہوگا؟ شکست تنہا ان امیر صاحب کی نہیں، شرمندگی ہم سب ہی کے حصے میں آئی ہے"

انہی محترم بزرگ کا ایک مضمون اسی موضوع پر اس سے پہلے بھی شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی طرف یہ فقرہ منسوب کر کے کہ "اصل مسئلہ اس وقت جمہوریت کی بحالی کا ہے" اسے پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے لیے ایک زبردست دینی سانحہ سے تعبیر کیا تھا۔

ہم ترجمان القرآن کی حالیہ اشاعتوں میں اس امر کی پوری طرح وضاحت کر چکے ہیں کہ جماعت اسلامی اور اس کے امیر نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس مقدس مقصد سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کیا، جسے وہ لے کر اٹھے تھے۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور نظامِ اسلامی کا نفاذ ہی جماعت کا اصل مقصود ہے۔ اسی نصب العین کے حصول کے لیے یہ زندہ ہے اور اسی کی جدوجہد میں وہ اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں کھپانے کا عزم رکھتی ہے۔ البتہ ہم اپنے کرم فرماؤں سے بصد احترام یہ بات کہتے ہیں کہ وہ براہِ کرم اس ٹھوس حقیقت پر ضرور غور کریں کہ عالمِ واقعات میں کسی اونچے اور بلند نصب العین کا حصول اتنا سہل اور آسان نہیں ہوتا جتنی کاغذ پر قلم کی مشق آسان ہوتی ہے۔ صدیوں کے بگڑے ہوئے ماحول میں، جہاں اسلام کی اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی اقدار بالکل تباہ ہو کر رہ گئی ہیں، جہاں ایک غلط نظامِ حیات سیاسی اور معاشی قوت کے بل بوتے

پر اپنی پوری جڑیں معاشرے کے رگ و پے میں اتار چکا ہے، اور جہاں مغربی فکر و تہذیب اور نظریات و عملیات کا غلبہ آکاس بیل کی طرح ہماری زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہو کر انہیں برباد کر رہا ہے، وہاں اگر کوئی جماعت اسلام کے غلبے کا راستہ صاف کرنے کے لیے ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے جس میں کم از کم آزادی کے ساتھ اس غلط نظامِ حیات کی یلغار کا مقابلہ کیا جا سکے تو اُسے پسپائی سے تعبیر کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔

زمان و مکان اور ظروف و احوال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بتدریج کام کرنا اور اندھا دھند ایسی پیش قدمی نہ کرنا جس کے لیے زمین تیار نہ ہو، عین تقاضائے حکمت ہے۔ اِس حکمت کو کسی ہوشمند نے کبھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انسان تو خیر کمزور اور ضعیف ہے۔ وہ ان رعایتوں کا لحاظ کرنے پر مجبور ہی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی جو قادرِ مطلق ہے۔ احکام و ہدایات دینے میں انسان کے حالات کی رعایتوں کو ہمیشہ اپنی نگاہ میں رکھا ہے۔ اُس نے مختلف ادوار میں اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کی ہدایت کے لیے جو مقدس نظام نازل فرمایا اس میں زمان و مکان کے تقاضوں کی پوری پوری رعایت کی گئی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام پر ہی وہ آخری شریعت نازل کر دی جاتی جو خاتم الانبیاء حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے۔ آغاز اور تکمیل کے درمیان جو مختلف مراحل درپیش تھے اُن کے پیش نظر ہی اللہ تعالیٰ نے دین کو اپنی مصلحت کے تحت ایک خاص مدت کے بعد مکمل فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کے بعد اگر زمان و مکان کے مصالح سے بے نیاز اگر کچھ مقدس ہستیاں ہو سکتی تھیں تو وہ انبیاء علیہم السلام کی ہستیاں تھیں جن کی خداوند تعالیٰ براہِ راست نگرانی فرماتا تھا اور اپنی حکمت کے تحت اُن کے ذریعہ اُس مقصد کی تکمیل کرواتا تھا جو انسانیت کا حقیقی اور صحیح مقصد ہے۔ جب ہم ان مقدس نفوس کی اصلاحی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ان جلیل القدر پیغمبروں نے بھی اپنی جدوجہد میں حالات کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

بدر و حُنَین کے معرکے پہلے روز ہی برپا نہیں کردیئے گئے، بلکہ ان سے پہلے ان کے لیے تیاری کا سامان فراہم کیا گیا۔ اسی طرح چور کا ہاتھ کاٹنے، شرابی کو دُرّے مارنے اور زانی کو سنگسار کرنے کی سزائیں دینے سے پیشتر ایک ایسا پاکیزہ ماحول تیار کرنے کی کوشش کی گئی جس میں قوت نیکی اور خدا ترسی کے ہاتھ میں ہو، لوگوں کے ضمیر بیدار ہوں اور وہ اخلاق کی پاکیزگی کو دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز خیال کرتے ہوں۔

یہ گذارشات ہمارے اپنے ذہن کی اختراع نہیں بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جن کی تصدیق قرآن، اسوۂ رسول، خلافتِ راشدہ کے طرزِ عمل، صحابہ اور اُمّت کے دوسرے پاکباز لوگوں کی زندگیوں، فقہ اسلامی کی تصریحات اور عقل سے ہوتی ہے۔

دُور نہ جائیے، زمان و مکان کی رعایت اور اختلافِ احوال کے لحاظ سے طریقِ کار میں تغیّر کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے حفظ و بقا کے لیے آج سیکولرزم کو کتنا ضروری خیال کیا جا رہا ہے اور وہاں کے مسلم زعما اس پر کتنا زور دے رہے ہیں۔ اسلامی نظام کا قیام تنہا جماعت اسلامی کا ہی نصب العین نہیں ہے۔ یہ فرض ہر اُس شخص پر عائد ہوتا ہے جو اللہ اور اُس کے رسول پر صدق دل سے ایمان رکھتا ہو۔ اس سے کوئی مسلمان بھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ جب حقیقت یہ ہے تو ماننا پڑیگا کہ جو کچھ ہمارے لیے باطل ہے وہ ہر مسلمان کے لیے باطل ہے۔ اب اگر یہ اصرار کیا جاتا ہے کہ آخری منزلِ مقصود سے کم تر کسی چیز کو کسی مرحلے میں عارضی طور پر بھی گوارا کر لینا سخت گمراہی ہے تو پھر ہندوستان میں سیکولرزم کی حمایت یا کم ازکم اسے ایک وقتی مجبوری کے تحت برداشت کرنا بھی اتنی ہی بڑی زیادتی ہے جس کی وجہ سے یہ حضرات پاکستان کی جماعت اسلامی کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگر جماعت اپنے ملک کے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر جمہوریت کی حمایت کر کے اِہدام دین کا ارتکاب کر رہی ہے تو پھر اس الزام سے وہ مقدس لوگ کس طرح

بچ سکتے ہیں جو ہندوستان میں ایک ایسے نظام کی حمایت کر رہے ہیں جو لادینی کے نظریے پر مبنی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جائے اور اس میں گروہی وابستگیوں کو قطعاً حائل نہ ہونے دیا جائے۔ اگر زمان و مکان اور حالات کی نزاکتیں سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں تو پھر پاکستان، ہندوستان، برطانیہ، مصر اور عرب الغرض سب ممالک میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں انہیں اسلامی نظام کے قیام کی طرف فی الفور براہِ راست پیش قدمی کر ڈالنی چاہیے اور اس سے کم تر کسی چیز کو سرے سے برداشت ہی نہ کرنا چاہیے۔

یہ بات اگرچہ عقل و حکمت اور تدبر اور دانائی کے بالکل خلاف ہے لیکن اگر وقتی مصلحتوں اور حالات کے تقاضوں سے بے پروا اسلامی نظام کے قیام کی کوشش کرنا لازم ہو تو پھر درمیان کی کڑیوں کو یکسر نظر انداز کر دینا اشد ضروری ہے۔ پھر تدریج اور تقدیم و تاخیر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خود یہ حضرات ہر مرحلے پر وقت کے حالات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں سیکولرزم کی حمایت آخر حالات کی اسی رعایت ہی پر تو مبنی ہے جس کے جرم میں جماعت اسلامی پاکستان اور مولانا مودودی کو گردن زدنی قرار دیا جا رہا ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ ہندوستان کے وہی بزرگ جو جماعت اسلامی پاکستان پر جمہوریت کی حمایت کی وجہ سے سخت برہم ہیں اور اسے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی موت سے تعبیر کرتے رہے ہیں، خود انہوں نے اپنے ایک نوٹ میں حالات کی رعایت کو ضروری اور دینی جدوجہد کی راہ کا سنگِ میل قرار دیا ہے۔ اس نوٹ کا پس منظر یہ ہے کہ کسی صاحب نے جماعت اسلامی ہند پر یہ گرفت فرمائی تھی کہ:

> "یہ (جماعت اسلامی ہند والے) وہی تو ہیں جو ابھی کل تک کہہ رہے تھے کہ سیکولر حکومت ایک طاغوتی و شیطانی طریق حکومت ہے اور اب کہتے ہیں کہ ہم

ہندوستان کی سیکولر حکومت کے وفادار ہیں۔ ان کے دعوتِ وفاداری پر لیسے یقین لیا جائے؟"

اس پر مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"قرار دادِ جرم کی بنیاد یہ ہے کہ دونوں دعووں میں تضاد و تناقض ہے اور حکومتِ الٰہیہ پر ایمان رکھنے والا کسی سیکولر سرکار کا وفادار کیونکر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بنیاد ہی سرے سے صحیح نہیں۔ دونوں دعووں میں تناقض کوئی نہیں، صرف تغایر ہے۔ ایک شے تو ہوتی ہے کوئی عقیدہ بطور آئیڈیل یا آخری مطمحِ نظر کے اور ایک شے ہوتی ہے اس کی عملیت بہ قیدِ زمان و مکان یا بزبانِ انکلامی زبان ہیں، بہ رعایتِ ظروف احوال۔ آئیڈیل تو اسلام کا اوّل دن سے حکومتِ الٰہیہ ہے لیکن آخر ۱۳ سال تک خود سرورِ کائنات نے مکہ کی غیر اسلامی حکومت کے اندر بسر کیے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی حکومت کے ماتحت ایک مدت بسر کی۔ ابراہیم علیہ السلام نے ایک حصہ عمر کا جاہلی حکومت کے اندر گزارا۔ مسیح علیہ السلام نے ساری عمر رومی مشرک حکومت کے تحت بسر کی۔ اور غداری اور بے وفائی ان پیغمبرانِ برحق کی ایک بار بھی منقول نہیں۔ بلکہ یوسف علیہ السلام نے تو اس غیر الٰہی حکومت کے ماتحت عہدہ تک اپنی طلب سے حاصل کر لیا۔ تو جب حالات آئیڈیل کے لیے سرے سے ناسازگار ہوں اور کوئی توقع درجۂ ضعیف میں بھی قیامِ حکومتِ الٰہیہ کی نہیں ہو سکتی تو جو صورتِ حال سب سے غنیمت اور اہون اور قابلِ عمل نظر آئے اس کو قبول کیا جائیگا۔ اور قانون و دستور کے مطابق چل کر کوئی شبہ بھی غداری کا نہ پیدا ہونے دیا جائے گا۔ اسلام ایسی آئیڈیل ازم کا قائل نہیں جسے کوئی تعلق حقائق سے نہ ہو بلکہ جو ہوا میں معلق ہو۔ اس میں جماعت اسلامی ہند والوں یا کسی بھی مسلمان گروہ کو کوئی بات نہ شرمانے کی ہے نہ گھبرانے کی۔"

مندرجۂ بالا اقتباس میں خط کشیدہ سطور کا بغور مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان میں مقصد اور

حصولِ مقصد کے درمیان عملی دشواریوں کے جو کٹھن مراحل درپیش ہوتے ہیں۔ انہیں کس صفائی کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے اور پھر یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جو شخص یا گروہ بھی کسی بلند مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے وہ راستے کی مشکلات اور ناسازگاریوں اور موانع سے یکسر بے نیاز ہو کر نہیں چل سکتا۔ دنیا میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نظام کے قیام کے لیے کسی گروہ کو صاف ہموار اور بالکل کھلا راستہ مل گیا ہو۔ ہر رائج الوقت نظام، زندگی کے سارے شعبوں پر پوری ہمہ گیری کے ساتھ مسلط ہوتا ہے، اور وہ تغیر کے سارے راستوں کو مسدود کرکے اپنی فرمانروائی قائم کرتا ہے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جس پر اُس کی پوری گرفت موجود نہ ہو۔ اب اس کی جگہ جب کوئی فرد یا گروہ کوئی دوسرا نظام قائم کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے لامحالہ قدم قدم پر مختلف موانع اور دشواریوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ جگہ جگہ اُس کے دامن سے مخالفوں کے کانٹے اُلجھتے ہیں اور ہر گام پر اُس کا راستہ روکنے کے لیے زبردست چٹانیں حائل ہوتی ہیں۔ ان مختلف دُشواریوں میں سے اپنا راستہ نکالنے کے لیے اُسے لامحالہ ہر مرحلے پر وہ تدبیر اختیار کرنی پڑے گی جس سے چند قدم منزلِ مقصود کی طرف بڑھنا ممکن ہو اور جس کے لیے موانع میسر آجائیں۔ یہی چیز قابلِ عمل، حکیمانہ اور عقل کے قریب ہے۔ اور اسی کی تلقین مولانا خود فرما رہے ہیں۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر ان کی اپنی بیان کردہ اسی معقول روش کو جماعت اسلامی پاکستان اختیار کرے تو آخر اُس کی شامت کیوں آجاتی ہے۔

ہم جماعت اسلامی کی تاسیس کے وقت سے آج تک مسلسل یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ ہماری جدوجہد کا مقصد بجز رضائے الٰہی کے حصول کے اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن خود یہی مقدس مقصد اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اپنی انفرادی زندگی میں احکامِ الٰہی کی پابندی کرنے کے ساتھ اجتماعی زندگی میں بھی اُسی کے عطا کردہ قوانین جاری کرنے کی کوشش کریں تاکہ اہلِ ایمان کے لیے دین کے سارے مقتضیات کو باحسن طریق پورا کرنا ممکن ہو، اور وہ بھلائیاں فروغ پاسکیں جنہیں خدا کا دین

فروغ دینا چاہتا ہے اور وہ برائیاں دبیں جنہیں خدا کا دین دبانا اور مٹانا چاہتا ہے یہی وہ اصل غرض ہے جس کے لیے ہم سیاست میں دخل دیتے ہیں۔ ہمارے اس سیاسی کام کو خواہ کوئی شخص "دنیا داری" کہے یا "ہوسِ اقتدار"، لیکن وہ علیم و خبیر ذات جو دلوں کے بھید جانتی ہے، اُسے اس بات کا پوری طرح علم ہے کہ ہم یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے اصل محرکات کیا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خود حکومتِ الٰہیہ کا قیام بھی ہمارا مقصود و مطلوب نہیں بلکہ ہمارے اصل مقصد یعنی رضائے الٰہی کے حصول کا محض ذریعہ ہے۔ اور اس ذریعہ کو اپنے امکان کی حد تک عمل میں لانے کی کوشش کرنا بھی ہم اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر اگر محض حکومتِ الٰہیہ کا نقشہ پیش کر دینا ہوتا تو ہمیں قطعاً زحمت نہ ہوتی۔ ہم خدا کے فضل سے اس نظام کو اس کی مثالی صورت میں پوری تفصیلات کے ساتھ کتابوں کے صفحات میں منتقل کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ ہم اس نظام کو کوئی ما فوق الطبعی عقیدہ خیال کر کے اسے محض روحانی سرور کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک قابلِ عمل چیز سمجھ کر اس دنیا میں اسے نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں تاکہ باطل سے ستائی ہوئی انسانیت اس کے زیر سایہ سکون اور آرام حاصل کر سکے اس لیے عملی جد و جہد کی راہ میں ہمیں لامحالہ اُن حالات سے بھی سابقہ پیش آتا ہے جن میں دو ناگزیر برائیوں کے درمیان کم تر برائی کو عارضی اور وقتی طور پر گوارا کرنا پڑتا ہے۔ ہم یہ طرزِ عمل اُسی اصول کے تحت اختیار کرتے ہیں جس کی صحت خود یہ محترم بزرگ اور اُمت کے دوسرے اکابر تسلیم کر چکے ہیں اور جس کی رُو سے نامور علماء آج بھارت میں کھلے کھلے ہندو راج کی بہ نسبت سیکولرزم کو غنیمت سمجھ رہے ہیں۔

خواب و خیال میں بسنے والے ناقدین جو چاہیں کہتے رہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے لیے حالات جتنے آج ناساز گار ہیں اتنے کبھی نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ دخل تو اجتماعی زندگی کی تبدیلیوں کا ہے، کچھ غیر مسلم قوموں کے اقتدار کا اور کچھ اُن مسلمان قائدین کے غلط طرزِ عمل کا جن کے ہاتھ میں اس وقت مسلمان ممالک کی سربراہی اور قیادت ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نقد و احتساب کرنے والے حضرات ذرا اُن مشکلات

اور موانع کو بھی ذہن میں رکھیں جو اس وقت اسلامی نظام کی راہ میں حائل ہیں۔ اس راہ کی سب سے بڑی دشواری وہ جکڑ بندی ہے جو ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ اور جس نے افراد کو مجبورِ محض بنا کر رکھ دیا ہے۔ اسے سوءِ اتفاق سمجھیے یا باطل نظام کے علمبرداروں کی فراست کہ انہوں نے اس نظام کو اتنا ہمہ گیر بنا دیا ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اور اُس کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں رہا جو اُس کے ہمہ گیر اثرات سے آزاد ہو۔ اگر آپ کوئی خالص ادبی کتاب لے کر اُس کا مطالعہ کریں تو اُس میں اُسی کی رُوح پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوگی۔ اگر فلسفہ اور نفسیات کی طرف رجوع کریں تو آپ انہیں اسی کے شارح اور ترجمان پائیں گے۔ اگر حکومت اور قانون کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ صرف اسی کے نفاذ اور تسلط کے لیے وہ وجود میں آئے ہیں۔ اگر نظامِ معیشت اور معاشرت کا جائزہ لیا جائے تو آپ کو بڑی شدت کے ساتھ اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ یہ بھی اسی کی ترقی اور نشوونما کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ الغرض آپ زندگی کا کوئی دُور دراز گوشہ بھی ایسا تلاش نہ کر سکیں گے جو اس باطل نظامِ حیات کی گرفت سے کسی قدر بھی آزاد ہو۔ اور تو اور زندگی کے خالص روحانی اور اخلاقی گوشوں پر بھی اسی کی پرچھائیں صاف دکھائی دیتی ہے۔ آج اگر کوئی فرد یا گروہ انسانیت کو اس نظام کے چنگل سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے زندگی کے کسی گوشے میں بھی کوئی ایسا محفوظ مقام میسر نہیں آتا جہاں سے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی جد وجہد کا آغاز کرے۔

اسی طرح اُسے جس دوسری دُشواری سے سابقہ پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ جُوں توں کر کے کسی کونے میں اپنے پاؤں جمانے کی کوشش بھی کرے تو اجتماعی حالات کا ریلا انہیں فوراً اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔

زمان و مکان کے سمٹ جانے کی وجہ سے ایک تو دنیا کے دُور دراز گوشے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو چکے ہیں کہ اجتماعی تغیّرات کی ہر کروٹ سے وہ پوری شدت کے ساتھ متاثر

ہوتے رہتے ہیں۔ پھر ان تغیرات کی رفتار اتنی تیز اور ان کی روانی تند ہوتی ہے کہ انسان اپنی خواہش اور تمنا کے علی الرغم اُن کے رُخ بہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ آپ اگر ان تغیرات کے وسیع اور ہمہ گیر اثرات کا ہلکا سا جائزہ لینا چاہیں تو آپ صرف ریڈیو اور ٹیلیویژن کی کارگزاریوں پر غور کریں اور دیکھیں کہ انہوں نے ہماری معاشرتی زندگی کے دُور دراز گوشوں پر کس نوعیت کے نتائج کتنی برق رفتاری کے ساتھ مرتب کیے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہماری نوخیز نسلیں کسی کلب اور سنیما گھر میں نہیں بلکہ عین گھر کی چار دیواری میں والدین کی آنکھوں کے بالکل سامنے ایک ایسی تربیت حاصل کر رہی ہیں جس نے ہمارے معاشرتی ڈھانچہ کو بالکل متزلزل کر کے رکھ دیا ہے۔

یہ باطل نظام چونکہ مادیت کی بنیاد پر قائم ہے اس لیے اس میں معیشت اساس کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اسی کے مطابق زندگی کی ساری قدریں متعین ہو رہی ہیں اور اسی کے استحکام کے لیے حیاتِ انسانی کی بیشتر سرگرمیاں وقف ہیں۔ یہ معیشت ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہر قدم پر منصوبہ بندیوں کی گرفت میں آ رہی ہے۔ اسی صورتِ حال نے اشتمالیت اور اشتراکیت کو جنم دیا ہے۔ وہ ممالک جو آزاد معیشت کے علمبردار کہلاتے ہیں اُن کے ہاں بھی منصوبہ بندیوں کا ایک ایسا جابرانہ سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے جس نے فرد کی آزادی کو محض ایک خواب بنا کر رکھ دیا ہے۔ معاشی منصوبہ بندیوں کی کامیابی کا سارا دارومدار معاشرتی اور سیاسی جکڑبندیوں پر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے دَورِ جدید میں آزادی اور حُریت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود انسان انتہائی بے بسی کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے۔ منصوبہ بندی کا زبردست دباؤ انہیں جس طرف چاہتا ہے بے زبان گلّے کی طرح ہانک کر لے جاتا ہے۔ اس حقیقت کو آپ صرف ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمارے اس ملک میں اس اخلاقی انحطاط کے دَور میں بھی پردے کو خاصی اہمیت حاصل ہے اور چند اونچے خاندانوں کو چھوڑ کر پاکستان کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت عورتوں کی بے حجابی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ لیکن یہاں تعمیرات کے

جو نئے نقشے تیار کیے جا رہے ہیں اُن کی وجہ سے بغیر کسی قانونی دباؤ کے چند سالوں میں پردہ محض ماضی کی یادگار بن کر رہ جائے گا اور لوگ اپنی خواہش کے علی الرغم اپنی بہو بیٹیوں کو بے نقاب دیکھنے پر مجبور ہونگے۔ اگر منصوبہ بندی کے تحت تعمیرات کا ایک خاص طرز اتنے بڑے معاشرتی انقلاب کا ذریعہ بن سکتا ہے تو پھر معاشی منصوبہ بندیوں سے کیا کچھ تغیرات پیدا نہیں ہو سکتے۔ آپ اگر یورپ کی معاشرتی زندگی کے عظیم انقلاب کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سی تبدیلیاں صرف معاشی رجحانات کی رہینِ منّت ہیں اور ان میں ملکی قوانین کا کوئی خاص عمل دخل نہیں۔ یہ اختلاطِ مرد و زن، یہ شراب نوشی اور فحاشی، مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی ہوس، معاشرے کی طبقاتی تقسیم، ہر شخص کا سرعت کے ساتھ امیر بن جانے کا مجنونانہ جذبہ، خاندانی نظام کی بربادی، نوخیز نسلوں کی اخلاقی بے راہ روی، احترامِ انسانیت کا فقدان، انسان کے لطیف احساسات سے ایک عام بے پروائی بلکہ بیزاری اور بغاوت، اور انسانوں کے باہمی تعلقات میں کاروباری ذہنیت کی فرمانروائی، یہ سب انسانی زندگی میں معیشت کی غیر معمولی اہمیت کے بالکل فطری نتائج ہیں۔

اسی سلسلہ کی تیسری کڑی حکومت اور ریاست ہے "النّاسُ علیٰ دینِ ملوکہم" ایک پرانا مقولہ ہے جس سے حکومت کی اہمیت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ عوام الناس شعوری اور غیر شعوری طور پر انہی عادات کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں محلات میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جب تختِ شاہی پر کوئی خداترس انسان جلوہ گر ہوا تو لوگوں کے اخلاق میں خود بخود ایک صحت مند تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوتی۔ اسی طرح جب تاج کا وارث کوئی علم دوست شخص بنا تو پھر عوام میں علم کے چرچے ہونے لگے اور جب بد قسمتی سے کوئی ظالم اور اخلاق باختہ فرد حکومت کے تخت پر متمکن ہوا تو اخلاقِ عام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ ظالموں نے بڑی آزادی کے ساتھ شریف لوگوں کو ستانا شروع کیا، رشوت کا عام چلن ہونے لگا اور عیاشی ایک فیشن کے طور پر

معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی اور دیکھتے دیکھتے پوری اجتماعی زندگی اخلاقی انحطاط کا شکار ہو کر رہ گئی۔

تاریخ کے اوراق کا اگر ذرا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ سارے انقلابات بادشاہ کی کسی تحریک اور اُس کے عزم اور ارادے کے ثمرات نہ تھے بلکہ محض اس کے برسرِ اقتدار ہونے ہی میں یہ تبدیلیاں خود بخود واقع ہوتی چلی گئیں۔ ان کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ اقتدار پہلے دن ہی سے عوام کی نظروں کا مرکز و محور رہا ہے۔ معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر اس نے ہمیشہ عوام کی نگاہوں کو مفتوح کیا ہے اور وہ بیچارے اپنے آپ کو غیر محسوس طور پر انہی سانچوں میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں جنہیں اقتدار پسند کرتا ہے۔

عوامی زندگی پر تخت کی گہری چھاپ کے یہ واضح نقوش اُن ادوار میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں جب ریاست کا دائرۂ عمل بڑا محدود تھا۔ جب بادشاہوں کو عوامی مسائل سے براہِ راست کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ عالمِ بالا میں زندگی کے مستعار لمحات گزار کر تخت و تاج اپنی اولاد کو منتقل کر جاتے تھے۔ وہ اگر اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑے مستعد بھی ہوتے تو ان کا کام صرف اسی قدر تھا کہ اپنی سلطنت کو غیر ملکی حملوں سے بچائیں اور ملک کے اندر امن و امان قائم رکھیں۔ اُن کے مقابلے میں رعایا کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ مالیہ، لگان اور اسی طرح حکومت کی طرف سے عائد کردہ دیگر محصولات پابندی کے ساتھ ادا کرتی رہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرحدوں کی حفاظت اور نظم و نسق کے دائرے سے نہ حکومت تجاوز کرتی تھی اور نہ عوام اُس کے معاملات میں دخیل ہوتے۔ عوامی زندگی کی جوئے رواں جس رفتار سے چاہتی بہتی چلی جاتی۔

حکومت کے اس محدود دائرہ کار کی وجہ سے صنعتی انقلاب سے پہلے ملوکیت اور شہنشاہیت کے اندر بھی معاشرت اور معیشت بڑی حد تک آزاد تھیں اور معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کا کام کرنے والوں کے لیے بڑا وسیع اور کھلا میدان موجود تھا جس میں وہ جس طرح چاہتے اپنی صوابدید

کے مطابق کام کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مصلحین نے حکومت سے تعرض کیے بغیر بعض بڑے انقلابی کام سر انجام دیئے اور معاشرے کے اندر بڑی خوشگوار تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ یہ مصلحین جس طرح کا نظام چاہتے رائج کر دیتے۔ حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔ وہ اصلاحِ حال کا جو پروگرام بناتے اُسی پر اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے اور بادشاہ اُس میں کسی طرح کا دخل نہ دیتے۔ حکومت کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کے لیے کام کرنے کی بڑی گنجائش موجود تھی۔ معاشرے کے حسّاس اور فرض شناس افراد اصلاحِ احوال کے لیے پوری کوشش کر سکتے تھے اور اُن کی یہ کوششیں پوری طرح بار آور بھی ہوئیں۔

دَورِ جدید کی ایجادات نے اور خصوصاً زمان و مکان پر انسان کی حیرت انگیز فتح نے ریاست کی ہیئت اور اُس کے دائرۂ کار کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہے کہ ماضی کی حکومتوں کے برعکس، جو شہنشاہیت کی صورت میں بھی افراد کو فکر و عمل کی کافی آزادی دیتی تھیں، آج کی حکومتیں جمہوریت اور فرد کی آزادی کی دعویدار بننے کے باوجود انسانوں کو آزادی کا کوئی ایسا گوشہ عطا کرنے پر تیار نہیں ہوتیں جس میں وہ اطمینان کے ساتھ اپنی منشا اور مرضی کے مطابق عمل کر سکیں۔ چنانچہ دَورِ جدید کی انتہائی جمہوری حکومتوں کی گرفت بھی دورِ متوسط کی شہنشاہیت سے کہیں زیادہ مضبوط اور جابرانہ ہے۔

اِس تغیر کا دوسرا اثر ریاست کے دائرہ کی غیر معمولی وسعت ہے۔ آج کی ریاستیں ملک کے اندر اور باہر صرف امن و امان قائم رکھنے کے لیے ہی معرضِ وجود میں نہیں آتیں بلکہ اپنے سامنے بے شمار عزائم رکھتی ہیں اور اُن کی تکمیل کے لیے وہ سلطنت کے حفظ و بقا اور اُس کے اندر نظم و ضبط قائم رکھنے کا انتظام کرتی ہیں۔ آج کی حکومت کا دائرۂ کار اتنا وسیع اور اتنا ہمہ گیر ہے اور اُس کے فرائض اتنے زیادہ اور اُس کی ذمہ داریاں اتنی نازک اور متنوع ہیں کہ ماضی میں اُن کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔

آج کی حکومتیں مخصوص نظریات اور تصورات کی علمبردار بن کر معرضِ وجود میں آئی ہیں اور انہیں نظریات کے مطابق وہ حیاتِ انسانی کی تشکیل کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جسے وہ اپنے بنیادی تصورات کے مطابق ڈھالنے کے لیے اپنا ایک خاص پروگرام نہ رکھتی ہوں۔ یہ چیز اُن کی سلامتی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ نظریاتی ریاستیں اُسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہیں جب وہ اپنے سارے ذرائع و وسائل، اور اپنی آبادی کی ساری ذہنی، فکری اور جسمانی قوتوں کو اساسی تصورات کے مطابق ایک راستہ پر لگا دیں اور اگر وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں پوری ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتیں تو ان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ریاست کے عزائم اور اس کے دائرہ عمل کی اس تبدیلی نے موجودہ حکومتوں کو ایسی کلیّت پسند ریاستیں بنا دیا جو پوری زندگی پر محیط اور حاوی ہیں۔

فکر و نظر کی اس تبدیلی کے دیگر محرّکات میں ایک محرک وہ مادّی فلسفۂ حیات ہے جس پر اس وقت دنیا کا سارا فکری اور عملی نظام چل رہا ہے۔ تاریخ کے صفحات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جب کسی قوم کے قلب و دماغ سے آخرت کی جوابدہی کا احساس مٹتا چلا گیا تو اُس وقت اُس قوم کے افراد کی انفرادیت بالکل ختم ہو کر رہ گئی اور انہیں اجتماعی نظم و ضبط کا پابند بنانے اور اُن کی صلاحیتوں کو بزعمِ خود تعمیری کام پر لگانے کے لیے انہیں آئین و ضوابط کی بے شمار حدبندیوں میں جکڑنا پڑا۔ چنانچہ دیکھیے کہ یونان اور رُوم کے اندر آخرت کی مسئولیت کا چونکہ کوئی صحیح تصوّر نہ تھا اس لیے اُن کی "شہری ریاستوں" کا دائرہ کار بھی وسیع تھا۔ پھر مذہب کے عروج کے بعد انسان کے اندر روح کے وجود کا شعور پیدا ہوا اور وہ آخرت کی باز پُرس کے خوف سے داخلی محرکات کے تحت اپنی زندگی کو اخلاق کا پابند بنانے لگا تو قوانین کا دائرہ سکڑنے لگا۔ پھر صنعتی انقلاب کے بعد جب مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو احساسِ جوابدہی کے چہرے پر بھی مُردنی چھا گئی اور انسان کی ترقی اور اُس کے نشوونما کے لیے قوانین کا سہارا

لینا پڑا اور اس طرح ریاست کو اجتماعی زندگی کے مسائل سے بھی کہیں زیادہ آگے بڑھ کر اُن معاملات میں براہِ راست دخیل ہونے کی ضرورت پیش آئی جو انسان کے خالص ذاتی معاملات ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ریاستیں بڑی سرعت کے ساتھ آمریّت کے آغوش میں جا رہی ہیں اور وہ حکومتیں جو جمہوریّت کی دعویدار ہیں اُن میں بھی افراد لاتعداد ناروا پابندیوں میں بہت بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔

جو قیادت جتنی زیادہ انقلابی اور اجتماعی زندگی میں جتنی سرعت کے ساتھ تبدیلیاں لانے کی آرزومند ہوگی اُتنے ہی اس کے عزائم وسیع اور مزاج آمرانہ ہوگا۔ اس اصول کی صحت کا اگر آپ اندازہ لگانا چاہیں تو ذرا چین، جاپان، انڈونیشیا اور مصر کے حالات کا بغور مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ یہاں جمہوریت کی بجائے آمریّت کو کیوں نہایت جبر کے ساتھ مسلّط کیا جا رہا ہے اس کی وجہ اگر معلوم کرنی ہو تو مغرب کے فاضل مفکر آئی۔ آر سینا نے (I.R. SINAI) کی کتاب (THE CHALLENGE OF MODERNIZATION) مطالعہ فرمائیں۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اہلِ مشرق ماضی کی روایات کے پابند ہیں اور اُن کی یہ پابندی اُن معاشی اور معاشرتی عزائم کی تکمیل میں حائل ہوتی ہے جو مغربی تہذیب و تمدّن کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس بنا پر سینا نے اس بات کا قائل ہے کہ مشرق میں مذہب کے نقوش مٹانے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں آمریّت کو مستحکم کیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ اہلِ ملک کی منشا اور مرضی کے خلاف جبر کے زور سے مغربی تہذیب کو مسلّط کیا جا سکے۔ حکومت کا دائرہ جتنا وسیع اور اُس کی گرفت جتنی مضبوط ہوگی اُسی نسبت سے مادی فلسفۂ حیات اور اس کے نتیجے میں مادی تہذیب کو پروان چڑھانے میں آسانی ہوگی۔

یہ ہیں وہ نامساعد حالات جن میں آج اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو (باقی صفحہ ۶۹ پر)